اُردو زبان میں قومی شاعری کا آغاز

عذرا وقار

۱۸۵۷ء ہماری تاریخ کا وہ اہم موڑ ہے جس نے نہ صرف سیاسی و اقتصادی لحاظ سے مسلمانوں کو ذہنی صدمہ پہنچایا بلکہ ذہنی، فکری اور تہذیبی لحاظ سے بھی انہیں کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ انگریزی حکومت اور انگریزی تعلیم کے ساتھ مغربی افکار و اقتدار کا سیلاب اس تیزی سے آیا کہ برصغیر کے باشندوں کے طرزِ فکر، طرزِ احساس اور طرزِ عمل کو تیزی سے بدلنے لگا۔ اب سے پہلے مسلمان مذہبی اقدار کے حوالے سے سوچتے تھے۔ مگر اب مغربیت کے اثر سے عقلیت، تجربہ، سائنس، مادی زندگی کی افادیت، اجتماعیت کو بنیادی قدروں کی حیثیت حاصل ہوگئی، تو اس کا اثر مسلمانوں کے دینی، فکری اور تہذیبی تصورات پر بھی ہوا۔ وہ مغربی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے متاثر ہونے لگے۔ سرسیّد احمد کی تحریک علی گڑھ کا مقصد یہی تھا مسلمانوں کو وقت کے تقاضوں کے مطابق نئی تعلیم سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔ سرسیّد کی اصلاحی تحریک نے ادب میں مقصدیت کو رواج دیا۔

برصغیر کے نئے حالات نے نئے تصور کو اُبھارا اور اُردو کے شعرا نے درباروں کی دُنیا سے باہر جھانکنا شروع کیا۔ لکھنے والوں نے شعوری طور پر ادب کا رشتہ اپنے زمانے کی سیاست اور سماج سے جوڑ کر اجتماعی زندگی کے مسائل کا عقلی حل پیش کرنا شروع کر دیا[1]۔ زندگی کی مادی ضرورتوں کو براہ راست قابلِ توجہ سمجھ کر ارضی زندگی کی ترقی و تکمیل پر زور دینے لگے۔ جدید اُردو شاعری کا بیج اُس وقت بارور ہونا شروع ہوگیا جب قدیم دلی کالج کا شیرازہ بکھر گیا اور اسے لاہور منتقل کرنے کے بعد گورنمنٹ کی تحویل میں دے دیا گیا۔ چنانچہ علم و ادب کی وہ شمع جس نے قرونِ اوّل میں شمال سے جنوب کی طرف سفر کیا تھا اور ولی دکنی کے زمانے میں جنوب سے شمال کی طرف مراجعت کی تھی، اب لاہور روانہ ہوگئی اور اس قافلے میں مولوی کریم الدین احمد، پنڈت بن پھول، مولوی سیّد احمد دہلوی، الطاف حسین حالی، پیارے لال آشوب، درگا پرشاد نادر اور محمد حسین آزاد جیسے ادبا شامل تھے[2]۔ محمد حسین آزاد (م ۱۹۱۰) کو یہ اہمیت حاصل کہ اُنہوں نے اُردو کی پیدائش کا نظریہ پیش کیا اور آزاد نے غزل کی مقبولیت کے دور میں اُردو نظم کی ترویج اور شاعری کو محدود احاطوں کی قید سے نجات دلانے کا بیڑا اُٹھایا۔ محمد حسین آزاد نے ان نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انجمن پنجاب کا پلیٹ فارم، جس کی تنظیم کا سہرا ڈاکٹر لائٹنر کے سر ہے، کو استعمال کیا اور ایک فعال ادبی تحریک پیدا کر دی۔

ڈاکٹر لائٹنر کو احساس تھا کہ لارڈ میکالے کی حکمتِ عملی کے مطابق انگریزی زبان کے ذریعے علوم سکھانے کا طریقِ عمل مشکلات سے دوچار تھا۔ لاہور میں گورنمنٹ کالج کا قیام عمل میں آیا تو اُس کے پہلے پرنسپل بنے۔ اُنہوں نے یہاں کی تعلیمی اور

معاشرتی اصلاح کا کام شروع کیا۔ ۱۸۴۵ء میں انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب کی داغ بیل اُنہوں نے ڈالی۔ اس کی ہفتہ وار محفلوں میں ایک تجویز اورینٹل یونیورسٹی کے قیام کی تھی۔ انجمن پنجاب میں پڑھے گئے مضامین پر بحث ونظر کی عام اجازت تھی۔ مجلس تنقید کو پنجاب انجمن پنجاب ہی نے متعارف کرایا۔ عملی علوم میں عالی ظرفی، کشادہ نظری اور وسعت نظر کے جذبات کی ترویج کی۔ ان تحریروں کو رسالہ انجمن پنجاب میں شائع بھی کیا جاتا۔ انجمن کے جلسوں میں محمد حسین آزاد کے مضامین کی تحسین بہت زیادہ ہوئی اور وہ وہاں لیکچرار بھرتی ہو گئے۔

ڈاکٹر لائٹنر نے انجمن پنجاب کی تحریک کو مقبول بنانے کے لئے مستقل لیکچرار کے دائرہ عمل میں روسا کے مکان میں جہاں نجی سطح پر مشاعرے، مناظرے اور عملی وادبی محفلیں ہوتی تھیں، حاضری ضروری قرار دی۔ محمد حسین آزاد کی تعیناتی نے انجمن پنجاب کی تحریک کو نئی توانائی دی۔ اور ایک اختراع یہ کی کہ جلسۂ عام کے اختتام پر روایتی مشاعرے کا اضافہ کر دیا۔ محمد حسین آزاد خود ایک آزاد منش انسان تھے تعصب اور تنگ نظری سے اُنہیں نفرت تھی۔ ان سب کی روشن جھلکیاں اُن کی تصنیفات میں نظر آتی ہیں۔ دوسری بات اُن میں طلب علم کی خواہش تھی۔ اُن کی تیسری خصوصیت وطن دوستی تھی۔ آزاد اپنی جماعت کے کمرے میں بھی مشاعرے کرواتے اور طلبہ میں شاعری کا ذوق پیدا کرتے۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں اپنی نظمیں پڑھ کر اہل ذوق سے رائے حاصل کرنا بھی اُن کا مقصد تھا۔ آزاد مشاعرے کے ذریعے شاعری میں نیا انداز رائج کرنے کے آرزومند تھے۔ پہلے تو یہاں روایتی شاعری سنائی جاتی مگر رفتہ رفتہ اسے موضوعی مشاعرہ بنا دیا گیا اور یوں نئی شاعری کے فروغ کے لئے زمین ہموار ہونے لگی۔ واضح رہے کہ موضوعی نظم لکھنے کا اولین تجربہ آزاد نے نہیں کیا بلکہ اُردو شاعری میں نظم کی روایت زمانہ قدیم میں موجود تھی۔ مثلاً سلطان محمد قطب شاہ کی کلیات مثنوی جو دکن سے لکھنؤ ہوتی ہوئی لاہور پہنچی۔ جہاں آزاد اور حالی نے اسے حیات نو بخشی۔ قصیدہ اور شہر آشوب بھی نظم کی صورتیں تھیں اور مرثیہ بھی نظم ہی میں لکھا جاتا تھا یہ آخر میں نظیر اکبر آبادی نے اُردو نظم کا جو ڈھانچہ بنایا اسے آزاد نے ارتقاء کی اگلی منزل پر پہنچایا[۳]۔

آزاد نے نظم نگاری کی شعوری تحریک کی اور شعراً کو باقاعدہ ترغیب دیکر نظم کہنے پر مائل کیا۔ آزاد کی متشرقین کی صحبت کے باعث اُن کے ہاں فکری تصادم کی راہ ہموار ہوئی اور ایک نئی تحریک کا نقطۂ آغاز بن گئی۔ اُنہوں نے ۱۸۷۴ء میں ایک تقریر نیچر کی شاعری پر کی جس میں اُنہوں نے کہا کہ ضرورت کے مطابق استعارہ اور تشبیہ اور اضافوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی، اظہار اور اصلیت بھاشا سے سیکھیں۔ یورپ کی زبانیں اپنی اپنی شاعری پیش کر رہی ہیں جبکہ اُردو نظم کھڑی منہ دیکھ رہی۔ وہ مبالغے کے خلاف تھے اور سادگی جذبات کو اصل رنگ میں پیش کرنے پر زور دیتے۔ آزاد کے خیال میں غزل کے طرز میں ایک خیال اوّل سے آخر تک اچھی طرح تضمین نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اُنہوں نے نظم کے امکانات تلاش کرنے اور انہیں مؤثر طور پر آزمانے کے لئے تحریک پیدا کی۔ آزاد نے زبان اُردو کے بارے میں انقلابی خیالات کا اظہار انجمن پنجاب کے ابتدائی جلسوں ہی میں کیا۔ سات سال کی محنتِ شافہ کے بعد جب نظم اُردو کے حق میں فضا سازگار ہو گئی اور اسمٰعیل میرٹھی جیسے شعرا اُن کی آواز پر

کان دھرنے لگے تو آزاد نے مثنوی کی بحور میں نئے تجربوں کو آزمایا۔ اُن میں نہ صرف ترتیب و تنظیم کا نیا انداز جھلکتا ہے بلکہ مثنوی کے بیانہ میں قصیدے کا رنگ ہے۔

آ اے شب سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو
عالم میں شاہزادی مشکین نسب ہے تو

محمد حسین آزاد کو جس طرح نظم گوئی اور نئے تصورات ادب کو پھیلانے میں اولیت حاصل ہے۔ اس طرح اُردو میں قومی و وطنی منظومات کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا بھی اُن ہی کے سر ہے۔ اُن کے دل میں وطن اور قوم کی صحبت کارفرما تھی۔ وہ نئے حالات سے سمجھوتہ کر کے جدید شاعری کی بنیاد رکھ کر ایسی راہ اختیار کرتے ہیں جس پر چل کر قوم کے شعور اور ادراک کو بیدار کیا جا سکے۔ یہ ضرور ہے کہ اُنہوں نے شاعری کا نیا ڈھنگ زیادہ تر مغرب سے مانگا لیکن اسی نئی ہیت، نئے اسالیب اور نئے طرز سخن کے پس پردہ جو عوامل آزاد کے یہاں کام کر رہے تھے۔ ان کا تمام تر مقصد قوم کو بیدار اور تیار کرنا تھا۔ کیونکہ ایک تھکی ہاری قوم کا علاج یہی تھا کہ قوم کے گرد تنا ہوا روح پرور تخیلات کا جالا صاف کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ زندگی کی بقا قومیت کے فروغ اور عمل میں ہے۔ حب وطن کے بارے میں کہتے ہیں:

رکھتا جو سب پر لطف و کرم کی نگاہ ہو
اور دل سے ہر بشر کے لئے خیر خواہ ہو
ہر حال میں رہیں اسے اہل وطن عزیز
اور ہوویں نیک و بد روش جان و تن عزیز
الفت سے گرم سب کے دل سرد ہوں بہم
اور جو کہ ہم وطن ہوں وہ ہمدرد ہوں بہم [۴]

افرادِ قوم کو اُنہوں نے اس طرح مخاطب کیا:

آئینہ دل کا گرد سفر سے اُجال دو — پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو
قسمت کے یہ نوشتے نہیں جو نہ مٹ سکے — وہ گونجا طبل فتح کہ میدان لے لئے [۵]

مولانا الطاب حسین حالی (م ۱۹۱۴) دہلی کو چھوڑ کر بہ سلسلہ روزگار لاہور پہنچے اور وہیں انجمن پنجاب کے تحت رونما ہونے والی جدید شاعری سے متاثر ہوئے۔ وہ آزاد کی ادبی تحریک کے حامی و مقلد تھے۔ نقادوں کے مطابق جو تغیر حالی اُردو شاعری میں لائے وہ سراسر انگریزی ادب کا رہین منت ہے۔ قوم کے نکبت و ادبار نے انہیں شاعری کے ذریعے انقلاب برپا کرنے پر مجبور کیا اور اُسی پہنچ پر سوچنے لگے جس پر آزاد سوچ رہے تھے۔ حالی نے شاعری ایک بدلتے ہوئے ماحول کے تقاضے پورے کرنے

کے لئے ایک مخصوص اصلاحی تحریک کے زیر اثر کی۔ اس بدلے ہوئے سیاسی ماحول میں اصلاحی تحریک انگریزی ادب اور مغربی کلچر کی پیروی کرنا دراصل قوم کو خواب غفلت سے چونکانے کی طلب گار تھی۔ لاہور کے مشاعرے میں اُنہوں نے یہ نظم پڑھی۔

ہوتا ہے نومیدیوں کا ہجوم — آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم جھوم
اے وطن اے میرے بہشت بریں — کیا ہوئے تیرے آسماں و زمین
بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو — اُٹھو اہل وطن کے دوست بنو[۶]

حالی نے رُباعیات، قطعات، مرثیے، ترکیب بند اور قصائد میں اپنی راہ نکالی۔ رباعیات کا زیادہ تر موضوع ناصحانہ ہے۔ اس میں عروج وزوال، عزت وذلت اور حبالت۔ مکر وریا، خودغرضی، بے غرضی اور انقلاب، روزگار۔ وغیرہ جیسے مسائل کا تذکرہ ملتا ہے مرثیے میں حالی نے بلند قدروں کے خاتمے کا ماتم کیا ہے۔ اُنہوں نے مقدمہ شعر وشاعری لکھ کر اصول وضوابط وضع کیے۔

لکھتے ہیں:

''اہل یورپ جو آج لٹریچر میں بھی مثل علوم وفنون وصنائع کے تمام دنیا سے فائق ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس کی شاعری اور انشا کا لب لباب اُن کی زبانوں میں موجود نہ ہو۔ پس ہم کو چاہئے کہ جس قوم اور جس زبان کے خیالات ہم کو بہم پہنچیں ان سے جہاں تک ممکن ہو فائدہ اُٹھائیں''۔

''آجکل دیکھا جاتا ہے کہ شعر کے لباس میں اکثر نئے خیالات ہمارے جو اگلے شعرا نے بھی نہیں باندھے، ظاہر کئے جاتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ اس خاص زبان میں جو شعرا کی کثرتِ استعمال سے کانوں میں رچ گئی ہے ادا نہیں کئے جاتے بلکہ نئے خیالات جن الفاظ میں براہ راست ظاہر ہونا چاہتے ہیں انہیں الفاظ میں ظاہر کر دیے جاتے ہیں اس لئے وہ مقبول خاص وعام نہیں ہوتے۔ لیکن نئی طرز کی عام شاعری اگر سردست مقبول نہ ہو تو کچھ حرج نہیں۔ جب لوگوں کے مذاق رفتہ رفتہ اس سے آشنا ہو جائیں گے اور سچی باتوں کی لذت اور حالات سے واقف ہوں''۔

''پس ملک میں نیچرل شاعری کو پھیلانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ روزمرہ کی زبان استعمال کی جائے''۔

آجکل یورپ میں شاعر کے کمال کا اندازہ اس بات سے کیا جاتا ہے کہ اور شعرا سے کس قدر زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کئے ہیں[۸]''۔

حالی کے خیال میں بڑی شاعری سے سوسائٹی کو نقصان اور زبان کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اُن کے خیال میں ماضی میں مختلف

قوموں نے شاعری کے ذریعے اُس کی غیر معمولی تاثیر اور جادو کے باعث قوموں کو جگانے اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد کروانے کا کام کیا ہے۔ اُنہوں نے شعر کی ادبی اور بنیادی صفات کو مقدمہ شعر و شاعری میں بیان کیا کہ شاعری کا مقصد لفظوں سے کھیلنا نہیں شعر کا کام سچی واردات قلب کو اس طرح بیان کرنا ہے کہ وہ سننے والے کے دل میں اُتر جائے اور قوم کی اصلاح کرے۔ اس کو پستی سے نکال کر ترقی کی راہ پر ڈالے۔ مقدمہ میں اُنہوں نے شعر کی تاثیر اور جمالیاتی پہلو سے بڑھ کر اس کی اقتصادی اور سماجی حیثیت پر نظر ڈالی[۹]۔ حالی کے زمانے تک شاعری دماغی تفریح اور ذہنی مشغولیت تک محدود تھی اکثر 'فن برائے فن' کے بے جان اور فرسودہ نظریے کے پجاری تھے۔ سب سے پہلے حالی نے اسے محسوس کیا۔ حالی نے محسوس کیا کہ شعر و ادب زندگی سے لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ مقدمہ و شعر و شاعری لکھنے کا مقصد ہی تھا کہ شاعروں کو سمجھایا جائے کہ شعر کا اصل مقام کیا ہے اور شاعر اُس سے کیا کام لے سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دوکان سب سے الگ

وہ سمجھتے تھے کہ معاشرے میں شوسے بہت مفید مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں جیسے شیکسپیئر کے ڈراموں سے انگریزوں نے سیاسی، سماجی اور اخلاقی اقدار کو فروغ دیا۔ خود حالی کی شاعری۔ نے عوام کو بیدار کیا اور اُردو ادب کی نشاۃ الثانیہ میں بھرپور حصہ لیا۔

حالی نے چار سال لاہور میں گذارے جہاں اُنہیں مغربی ادب کو پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کو اس میں ایک نئی دنیا نظر آئی اور اُن کے مذاق شعر و ادب کا میدان کتنا وسیع ہے اور اس کا کام صرف واردات قلب کا بیان اور داستان عشق سنانا ہی نہیں بلکہ زندگی کی ترجمانی، کائنات کا مطالعہ، انسانوں کی اخلاقی اور معاشرتی معیاروں کو بلند کرنا بھی ہے اور لوگوں کے دلوں میں قوم کی محبت اور خدمت کے جذبات کو اُبھارنا بھی ہے۔ حالی مغربی ادب کا یہ اثر مقبول کرتے رہے اور مذاق شعر نئے سانچے میں ڈھلتا رہا۔ اُن کی چند نظمیں دیکھیں۔

برکھارُت:

باغوں نے کیا ہے غسل صحت — کھیتوں کو ملا ہے سبز خلوت
ہے سنگ و شجر کی ایک وردی — عالم ہے تمام لاجوردی

حب وطن:

علم کو کردو کو بکو ارزاں — ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں
گر رہا چاہتے ہو عزت سے — بھائیوں کو نکالو ذلت سے [۱۰]

نظم حبِ وطن، روانی، دلکشی، حسنِ ادا، اور سلاست بیان کے لحاظ سے بھی اور خیالات کے اعتبار سے بھی بہترین ہے۔ اس میں شاعر نے وطن کی محبت کے نظریے پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے۔ جب وہ لاہور سے دہلی واپس چلے گئے تو وہاں سرسیّد کے ایما پر مسدس، 'مدوجزرِ اسلام' لکھا اور صحیح معنوں میں نئی شاعری کا آغاز ہوا جو برابر جاری رہا اور پھیلتا گیا۔ آزاد چونکہ سرسیّد کی ہمہ گیر اصلاحی تحریک سے وابستہ نہیں تھے اس لئے ان کی کوششوں کا دائرہ وسیع نہ تھا جتنا کہ حالی کا تھا۔ یہ حالی ہی کا اثر تھا کہ ان کے ہم عصر شعراء نے اُردو شاعری کو سماجی زندگی کے سارے میلانات کا آئینہ بنادیا۔

مسدس حالی میں تاریخی احساس حال کے آشوب کا اظہار اور ماضی اور حال کا تضاد سب کچھ نمایاں ہے۔

وہ ملت کہ گردوں پہ جس کا قدم تھا
ہر ایک کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا
وہ امت لقب جس کا خیرالامم تھا
نشاں اُس کا باقی ہے صرف اسقدر
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں[۱۱]

حالی کے علاوہ اسماعیل میرٹھی، حسرت، اکبرالہ آبادی، شبلی، اقبال، سلیم، نظم طباطبائی، ظفرعلی خان کا کلام اس بات کا شاہد ہے کہ مذہب، معاشرت، ادب، تہذیب وتمدن، معیشت، سیاست، اخلاص غرض سماجی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس پر نظمیں نہ لکھی گئی ہوں۔ اس نئی شاعری کا اولین خطاب اجتماع سے ہے اور اجتماع کے توسط سے افراد سے۔ اس میں ایک طرح کا منظم اجتماعی احساس اور عمرانی ادراک، اجتماعی طور پر محسوس کئے گئے جذبات اور سوچے ہوئے افکار، قومی مسائل کا بیان اور ان کا عملی و عقلی حل نظر آتا ہے۔ یہ شاعری جذبات کی آسودگی سے آگے بڑھ کر ذہن وفکر کی بیداری و وسعت کو اپنا مطمع نظر بناتی ہے۔

مولانا حالی قومی مسائل پر نظمیں لکھنے والوں میں سرفہرست ہیں۔ مسدس حالی نے قومی اصلاح کے سلسلے میں جو کام کیا وہ علی گڑھ کے قیام سے کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں[۱۲]۔ اس سے پہلے حالی کی شاعری میں دردِملت اور اصلاح قوم کا جذبہ بیدار ہو چکا تھا مگر ابھی مصلحانہ جوش اپنے مشن کا احساس اور اپنی شاعری سے کام لینے کا کوئی واضح تصور موجود نہ تھا۔ مسدس حالی نئی شاعری کا ایسا نمونہ ثابت ہوا جس میں حالی نے ایک نئی شعری زبان پیدا کی۔ حالی نے ملک کے بگڑے ہوئے مزاق کو سدھارا اور سنوارا اور اُردو ادب کو پستی سے نکال کر بلندی کی راہ دکھائی۔

شبلی نعمانی (م ۱۹۱۶) علی گڑھ میں حالی سے متعارف ہوئے اور مسدس حالی سے گہرا اثر لیا۔ اُن کی پہلی شعری تخلیق 'مثنوی صبح اُمید' ہے۔ اس سے پہلے مثنوی صرف قصہ کہانیوں کے لیے تھی اب تک اُس کو قومی مقصد کے لئے کام میں نہیں لایا گیا

تھا۔ آزاد اور حالی کی طرح شبلی بھی اسی راہ پر چلے اور شاعری کو نیا رنگ و آہنگ عطا کر کے قومی مزاج کو یکسر بدل دیا۔

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام — جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی — جو تاج تھی فرق آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال — کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گل کر دیے چراغ جس نے — قیصر کو دیے تھے داغ جس نے
وہ نیزہ خوں فشاں کہ چل کر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اُڑا دیے تھے — اٹلی کو کنویں جھنکا دیے تھے [۱۳]

شبلی نے جس جرأت و ہمت سے سامراج پر چوٹیں کیں، شہنشاہت کے خلاف نظمیں لکھیں، غیر ملکی اقتدار کی جڑوں پر کلہاڑے چلائے، مسلمان عوام کو آزادی کی راہ پر گامزن ہونے کی تلقین کی، علماء کو حجروں سے نکلنے کی دعوت دی۔ اس کی مثال ان کے ہم عصروں میں ناپید ہے۔ شبلی پر یورپین مؤرخین فلاسفر کا اثر تھا۔ وہ اسلامیان ہند کی تہذیبی زندگی کے اُس موڑ کے راہنما میں جہاں سرسیّد کا بنایا ہوا راستہ تاریخی اعتبار سے ختم ہوتا ہے اور شاہراہ آزادی شروع ہوتی ہے۔ جس پر ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مختار احمد انصاری اور علامہ اقبال جیسی مقتدر ہستیاں گامزن نظر آتی ہیں اُن کی قومی و سیاسی نظموں نے قوم کے سوئے ہوئے جذبات کو جگایا۔ مسلم گیر کے بارے میں اُنہوں نے لکھا:

مختصر اس کے فضائل کو پوچھے تو یہ ہیں
محسن قوم بھی ہے، خادم حکام بھی ہے۔ [۱۴]

مولوی نذیر احمد (م۔۱۹۱۲)

مولوی نذیر احمد جدید سائنسی تعلیم سے بے حد متاثر تھے۔

یہ ریلیں سٹیمر، کلیں، تار برقی
بھلا ان کو کیا جانیں ہم لوگ مشرقی
کوئی روز شاید کہ جاتا ہو خالی
کہ یوروپ کے لوگوں کے اذہان عالی
نہ کرتے ہوں اک تازہ ایجاد کوئی
ہے تم میں بھی اے قوم ناشاد کوئی [۱۵]

مولوی اسمٰعیل میرٹھی (م ۱۹۱۷) سرسیّد کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ اُن کا مطمع نظر بھی وہی تھا جو اُس دور کے

دوسرے شاعروں کا تھا یعنی مسلمانوں کو ماضی کی جھلک دکھاتے ہوئے اور حال کی معاشی بدحالی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے غیرت دلانا اور جدید علم وفن سے خود کو آراستہ کرنے کی تلقین کرتا۔

یہ جنگ ہے اخلاق کی اور علم و ہنر کی
یہ جنگ ہے تحصیل عمل اور نظر کی
اس جنگ میں آسودگی ہے نوع بشر کی
آزادی ہے ملکوں کی تو آبادی ہے گھر کی۔ [۱۶]

مولوی اسمٰعیل اپنی شاعری سے قوم کا تشخص، انفرادیت، مذہب کا رنگ اور روایات واقدار کی چھاپ برقرار رکھنے پر زور دیتے تھے انہی عناصر پر قوم کی آزادی کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔ اُنہوں نے غیر توضیٰ نظمیں لکھیں بیت کے تجربات میں عبدالحلیم شرر نے دلچسپی لی۔ نظم طباطبائی نے انگریزی طرز میں نظمیں لکھیں ان شعراء کے علاوہ امجد علی اشہری، سرور جہاں آبادی، پنڈت برج نرائن چکبست، فضل آزاد بھی اُن شعراء میں شامل تھے جنہوں نے سیاسی وقومی شاعری کی۔

قومی وملی تحریک کا دور آخر اقبال (م ۱۹۳۸) تھے۔ ایک نئے رنگ، نئے آہنگ اور نئے تخیل کے ساتھ اُنہوں نے شاعری کی۔ اقبال کی وطنی نظموں میں اظہار کا انداز سب سے جدا ہے۔ اُردو نظم کی ترقی اور مغربی اثرات کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت اقبال میں سب سے زیادہ تھی۔ اُردو نظم میں اقبال نے محض زبان دانی کے جوہر نہیں دکھائے بلکہ زبان کی نئی وسعتوں کے بھی وہ خالق تھے۔ نئی ترکیبوں کی ایجاد نے انہیں زبان کی توسیع کا موقع دیا۔ مقامی محاورہ کی پابندی سے زیادہ اُنہوں نے وسیع تر قالب تیار کیے۔

اُنہوں نے بچوں کے لئے ایک نظم لکھی جس میں تمثیلاً ہندوستان کی غلامی کا ذکر کیا۔

آتا ہے یاد مجھکو گذرا ہوا زمانہ — وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی — اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

اُنہوں نے قوم کو باخبر کیا۔

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

اقبال نہ صرف اُس دور میں سیاسی منزل کی نشان دہی کی بلکہ وہاں تک پہنچنے کا راستہ اور زادراہ بھی تجویز کیا

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

کلام اقبال میں شاہیں اور شاہباز کو خصوصی علامت کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ شمع و پروانہ اور کرکِ شب تاب اور

آہو وغیرہ کی علامتیں بھی ہیں۔ جن کے ذریعے اُنہوں نے اپنے احساسات کو الفاظ میں ڈھالا اور اپنی قوم کو پیغام دیا۔ ان علامتوں کے ذریعے اُنہوں نے قوم کے خوابیدہ ذہن کو بیدار کر کے اُس میں آہو کی چوکڑی کا آہنگ پیدا کرنے کی سعی کی۔ وہ جب وطن کے گیت گاتے ہیں تو اُن کی اٹوٹ محبت ان کے شدید قومی احساس اور گہرے خلوص کا پرتو اس شعری میں نظر آتا ہے۔

اس دور کے بعض ایسے شاعر تھے جو لاہور کے ادبی مرکز سے دور تھے وہ انگریزی ادب اور تعلیم سے متاثر ہوئے جن میں نادر کاکوری، سرور جہاں آبادی، شرر لکھنوی، نظم طباطبائی، بے نظیر شاہ، اوج، شوق قدوائی، علمدار حسین واسطی، سید احمد کبیر، علی سجاد، عظمت اللہ خان حیدر آبادی، چکبت، تلوک چند محروم، ظفر علی خان، غلام مصطفیٰ خریں، پروفیسر شہباز وغیرہ نے بہت سی طبع زاد نظمیں لکھیں اور بعض انگریزی نظموں کے ترجمے لئے۔ بعض ترجمے دلکش اور تاثیر کے اعتبار سے اصل نظموں کے ہم پلہ سمجھے گئے اور بعض اصل سے بھی زیادہ دلکش و موثر ثابت ہوئے۔ جیسے نادر کاکوری نے ولیم رامبرز کی نظم کا ترجمہ بغیر کافیے کے کیا۔ اس میں انگریزی زبان کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی دلچسپیاں بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دل صد چاک پر[۱۷]

انگریزی سے ترجمہ شدہ معریٰ نظمیں اگرچہ اس وقت قبول عام سے محروم رہیں مگر بعد میں ان کوششوں کا نتیجہ نکلا اور نظم معریٰ اور نظم غیر مقفیٰ میں رفتہ رفتہ اچھی تخلیقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان شعرا نے علم و فن کے حصول کی ترغیب دے کر اور نئی روشنی اور نئے علوم کی طرف لوگوں کو راغب کر کے ایسا معرکہ سرانجام دیا جسے نہ صرف قومی تاریخ میں بلکہ اُردو ادب کی تاریخ میں نمایاں جگہ ملے گی جنہوں نے نئے ہونے کے باوجود انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مفتوح قوم کو اُن کے خلاف صف آراء کیا۔ چنانچہ جدید نظم بالعموم انگریزی تعلیم اور ادب کی مرہون منت ہے جس نے مضامین و موضوعات کے علاوہ اسلوب اور بیت پر بھی اثر ڈالا۔ عبدالحلیم شرر جنہوں نے فرانسیسی زبان سیکھی تھی اپنے معاصروں سے آگے قدم رکھا اور پہلی بار نظم معریٰ لکھی۔

اسمٰعیل میرٹھی نے بھی غیر مقفیٰ نظم لکھی۔ اس طرح اُردو ادب کا یہ ارتقائی سفر جاری رہا۔ دہلی، رام پور، پٹنہ اور حیدر آباد دکن کو اس جدید رجحان سے چنداں سروکار نہ تھا۔ وہاں قدامت قدم جمائے رہی۔ اور وہاں کے باکمال غزل گوئی اور دیگر اصناف سخن میں محو رہے۔ تاہم ملک کے طول و عرض میں بے شمار ایسے شاعر پیدا ہوتے جنہوں نے حب وطن، ملکی اور قومی امور، قدرتی مناظر، اقتصادی مسائل، اصلاحی رجحانات اور اتحاد قومی کے موضوعات کو جگہ دی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہ رجحانات قوی تر ہو گئے۔ انگریزی تعلیم کی عام اشاعت کی وجہ سے انگریزی خیالات سجائے ادب میں جگہ پانے لگے۔ نہ صرف

موضوع کے اعتبار سے بلکہ ہیت کے اعتبار سے بھی کچھ تبدیلیاں واقع ہوتیں۔ بعض اخبار مثلاً اودھ پنچ، اور، اودھ اخبار، در حقیقت ادبی رسائل کا درجہ رکھتے تھے۔ اُن کے ایڈیٹر دور حاضر کے تقاضوں سے باخبر تھے۔ بعض رسالوں کے مدیر انگریزی تعلیم یافتہ تھے اور یورپ کا سفر کر چکے تھے اور وہاں کی ادبی تحریکوں سے متاثر بھی ہوتے۔ ان کے رسالوں میں جدید رنگ لازماً آتا تھا۔ چنانچہ یہ رسائل جدید رجحانات کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ انہوں نے بھی انجمن پنجاب کی طرح اور علی تحریک کے زیر اثر ادب کو جدید رنگ سے روشناس کرانے میں مؤثر کردار ادا کیا اور یہ کہتے ہوئے منظر نامے میں حدود و قیود کو توڑا۔

ان رسائل میں شیخ عبدالقادر کے رسالہ ''مخزن'' دیا نرائن کا رسالہ 'زمانہ' پیارے لال ٹھاکر کا ادیب، بہت وقیع جریدے تھے جو جدید ادبی تحریکوں اور رجحانات کے علمبردار تھے۔ عبدالحلیم شرر کا 'دلگداز' اور ظفر الملک علوی کا 'الناظر' بھی اسی طرح کے مسائل تھے۔ کچھ عرصے بعد لاہور سے 'ہزار داستان' شباب اُردو' ہمایوں' ادبی دُنیا، نیرنگ خیال، عالمگیر، کارواں جیسے رسائل جاری ہوئے [۱۸]۔ جن میں حب وطن، مناظر قدرت، قومی اور تاریخی نظموں کے علاوہ انگریزی نظموں کے ترجمے بھی شائع ہوتے تھے۔ یہ دور کچھ ایسا تھا کہ ہر شخص زندگی کے مسائل کا مقابلہ کرنا سیکھ گیا تھا اور اپنی ذات اور حقوق کا عرفان اتنا بڑھ گیا تھا کہ کسی حقیقی یا فرضی معشوق کے آستانے پر مسلسل نامہ فرسائی ممکن نہ رہی تھی۔ وطن کی سربلندی، قوم کی اصلاح، ملت کی تعمیر، مشاہیر اور اکابر کی تعریف، سیاسی مسائل کا ذکر، مناظر قدرت کا بیان، نیز انگریزی نظموں کے ترجموں میں ایک قسم کی ادبی عظمت محسوس ہونے لگی۔ خصوصاً قومی اور ملی نظموں میں اور فطرت کی عکاسی میں انگریزی ادب کا رنگ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ جس میں ایرانی رنگ کے بجائے دیسی رنگ نظر آنے لگا تھا۔ ہیت کے نئے تجربات سے قافیے سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ پرانی ہیتوں میں نئے مضامین بیان کیے گئے۔ تکنیک میں تبدیلی ہوئی پرانی عبارتیں بدل لیں۔ الفاظ کے انتخاب اور لب و لہجے میں فرق پیدا ہو گیا۔ بدلے ہوئے موضوعات بدلے ہوئے تقاضوں کا نتیجہ تھا۔ اس طرح مغربی شاعری کے اثر سے اُردو شاعری میں جدید نظم کا ارتقاء شروع ہوا۔

جدید اُردو شاعری نے جنم لاہور میں لیا مگر اسے اپنی نشو ونما کے لئے علی گڑھ کی فضا راس آئی۔ نئے انداز اور جدید اسلوب کی نظمیں اسی شہر کے ادبی ماحول کی پیداوار ہیں۔ پہلی بار محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے اس انداز کلام سے یہاں دنیا کو روشناس کرایا جن کے اجلاس مختلف شہروں میں ہوتے تھے۔ مسلم لیگ کے قیام سے پہلے سیاسی اور نیم سیاسی حلقوں میں یہ کانفرنس ہی مسلمان قوم کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں بیانیہ نظمیں، تاریخی نظمیں، نصیحت آمیز اور اخلاقی، سیاسی نظمیں جدید شاعری میں جگہ پانے لگیں۔ بعض لوگوں نے انگریزی تحریریں بھی اُردو میں متعارف کروائیں۔ اسی طرح بلینک ورس بھی اُردو شاعری میں آئی۔ ہندی دوہے بھی لکھے گئے۔ وطنی ترانے جن کی بحریں بہت زوردار ہوتی تھیں۔ انگریزی تعلیم اور ادب کے باعث اسی عام افسردگی کو دور کرایا جو لکھنؤ اور دلی کی شاعری پر چھائی ہوئی تھی۔ اکثر جدید انماط شاعری میں داخل ہوئے اور نظم کو باثروت بنا گئے۔ نظم اس قابل ہو گئی کہ معنی کا نازک نازک فرق الفاظ سے ذریعے ادا کر سکے انگریزی کے اثرات نے اُردو کی

قدامت پرستی کی زنجیروں کو توڑ ڈالا، اُردو نظم گو شعرا میں ایک اعتماد پیدا کر دیا۔ انگریزی زبان و ادب کے متعارف ہونے سے نہ صرف انگریزی الفاظ اُردو میں مستعمل ہوئے بلکہ یہ الفاظ اپنے ساتھ نئے تصورات، نظریات اور تشریحات لے کر آئے۔ دن کے پردے میں نئے ادب اور جدید نظم کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ جس میں سیاسی، مذہبی، تاریخی اور طنزیہ نظمیں خصوصی طور پر سیاسی شعور کو جگا رہی تھی۔ چونکہ غزل کے مقابلے میں نظم میں خیالات ایک اکائی کی صورت میں فکر کو متحرک کر کے اُسے متحد کرنے اور انسانوں کو ایک مرکز پر لانے میں مدد دیتے ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (مدیران خصوصی، سید فیاض محمود۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی)، نویں جلد، اُردو ادب (چہارم)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء، ص ۴۵۔

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اُردو، پاکستان، ۱۹۸۵، ص ۳۶۸۔

۳۔ ایضاً، بحوالہ سابقہ، ص ۳۷۵۔

۴۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، جنگِ آزادی کے اُردو شعراء، اسلام آباد، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، ۱۹۸۶، ص ۱۶۲۔

۵۔ ایضاً، بحوالہ سابقہ، ص ۱۶۵۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۶۸۔

۷۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، بحوالہ سابقہ، ص ۱۱۱۔

۸۔ حالی، الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، لاہور، ساجد بک ڈپو، ت۔ن، ص ص ۱۳۴۔۱۶۶۔

۹۔ عابد حسین، صالحہ، یادگار حالی، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۶، ص ۳۲۳۔

۱۰۔ ایضاً، بحوالہ سابقہ، ص ۱۹۰، ۱۹۱۔

۱۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، بحوالہ سابقہ، ص ۳۰۰۔

۱۲۔ شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۴۔

۱۳۔ ندوی، سلمان سیّد، حیات شبلی، اعظم گڑھ، ۱۹۷۰، ص ۱۳۳۔

۱۴۔ عبداللطیف اعظمی، شبلی کا مرتبۂ ردوادب میں، کراچی، صفیہ اکادمی، ۱۹۶۷، ص ۱۵۴۔

۱۵۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، بحوالہ سابقہ، ص ۱۷۶۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۷۹۔

۱۷۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، بحوالہ سابقہ، ص ۲۷۲۔

۱۸۔ ایضاً، بحوالہ سابقہ، ص ۲۷۵۔

☆☆☆

کتابیات

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، ردوادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۸۵ء۔

۲۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، (مدیر فیاض محمود، عبارت بریلوی)، نویں جلد، اُردو ادب (چہارم)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء۔

۳۔ حالی، الطاف حسین، مقدمہ شعر وشاعری، لاہور، ساجد بک ڈپو، ت۔ن۔

۴۔ شیخ محمد اکرام، موج کوثر، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۲ء۔

۵۔ عابد حسین، صالحہ، یادگار شبلی، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۶ء۔

۶۔ عبداللطیف اعظمی، شبلی کا مرتبۂ ردوادب میں، کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۷ء۔

۷۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، جنگ آزادی کے ردوشعرا، اسلام آباد، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، ۱۹۸۶ء۔

۸۔ ندوی، سلمان سیّد، حیات شبلی، اعظم گڑھ، ۱۹۷۰

☆☆☆